ماہنامہ

بلوچ دنیا

ملتان

مئی ۱۹۸۷ء

میر برادران - مدتوں تک یاد آتے رہیں گے





الحاج میر علی احمد خان تالپور مرحوم

الحاج میر رسول بخش خان تالپور مرحوم

عوام دوستی - فقیری و درویشی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

یاد یار مہربان آید ہمے



میر غوث بخش خان بزنجو

الحاج میر علی احمد خان تالپور

کا اِنتقال عظیم قومی نقصان ہے!

بلوچوں پر ان کے بے حد احسانات ہیں۔

بزرگ سیاستدان میر غوث بخش خان بزنجو نے ملک کی معروف سیاسی شخصیت اور اپنے رفیق قدیم الحاج میر علی احمد خان تالپور کے انتقال پر دلی صدمہ اور انتہائی رنج وغم کا اظہار کیا ہے انہوں نے میر صاحب کی موت کو قوم وملک کے لیئے عظیم نقصان قرار دیا اور انکو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے مرحوم میر برادران کے دل ہمیشہ بلوچوں کے لیئے دھڑکتے تھے اور جب بھی بلوچستان کے بلوچوں پر سختی ہوئی اور ان کو حیدرآباد جیلوں میں لایا گیا۔ تو میر برادران ہر طرح کی خیالداری کرتے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ایوب دور میں جب سات بلوچوں کو سکھر و حیدرآباد کی جیلوں میں پھانسیاں دی گیئں۔ تو میر صاحبان نے شہیدوں کی لاشوں کو جیلوں سے وصول کیا اپنے باغ میں غسل دیا اور انکو بلوچستان پہنچانے کا خاطر خواہ اہتمام کیا اس قسم کے احسانات بلوچ قوم ہرگز نہیں بھول سکتی۔ آل پاکستان بلوچ ویلفیئر ایسوسی ایشن لاہور اور انجمن فلاح بہبود بلوچاں کے خصوصی اجلاس ہوئے جن میں میر صاحب کے انتقال پر شدید دکھ کا اظہار کیا گیا اور ان کی مغفرت کیلئے دعا کی گئی۔ اور مرحوم میر صاحبان کی اولادوں سے توقع کی گئی کہ وہ اپنے بزرگوں کی طرح بلوچوں سے غافل نہ ہوں گے۔؟

کامریڈ قادر بخش مطاہر — ایک مخلص ساتھی اور جانثار تھے!



میر غوث بخش خان بزنجو۔ نے مکران کے سفر کے دوران اپنے پرانے ساتھی اور پاکستان نیشنل پارٹی کے سینیئر نائب صدر کامریڈ قادر بخش مطاہر کے انتقال پر انتہائی صدمے کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مرحوم نہایت مستقل مزاج سیاسی رہنما تھے۔ انہوں نے عوام کے حقوق کے لیئے، غیر استحصالی معاشرے کے قیام کے لیئے، اور شرف انسانیت کے لیئے طویل قربانیاں دیں۔ عوامی سیاست کی تاریخ میں ان کو ہمیشہ خراج تحسین پیش کیا جاتا رہے گا؟



ماھنامہ **بلوچی دنیا** ملتان

باقاعدہ منظور شدہ برائے اشتہارات منجانب (PID) پریس انفارمیشن حکومت پاکستان
منظور شدہ برائے محکمہ تعلیمات حکومت بلوچستان

محترم قارئین، وش و وشحال باتے تشالا!

مئی مزدوروں کا علامتی مہینہ ہے۔ کوئٹہ کا زلزلہ اسی مہینے میں آیا تو تھا۔ اور اوّلین بلوچ قائد میر یوسف علی خان عزیز مگسی، بلوچی کے عظیم دانشور۔ سید ہاشمی اور نامور و محترم سیاستدان میر رسول بخش خان تالپور نے بھی اسی مہینے دار فانی سے کوچ کیا۔ الغرض بہت سی دردناک یادیں مئی سے وابستہ ہیں۔ ان کو تازہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تازہ ترین زخم الحاج میر علی احمد خان تالپور ایسی محترم شخصیت کے مرنے کا ہے۔ لوگو! یقین رکھو ایسے نادر و نایاب لوگ کم پیدا ہوتے ہیں۔

اللہ ان سب کو مغفرت کرے۔ آمین!

والسلام۔ نیازمند

چاکر خان بلوچ۔ ایڈیٹر

ایڈیٹر
چاکر خان بلوچ

ایڈیٹر معاون
فضل کریم

جلد نمبر ۳۰ شمارہ نمبر ۲
بابت مئی سنہ ۱۹۸۷ء

سالانہ بدل اشتراک ۳۰ روپے

قیمت فی پرچہ ۳ روپے

مقام اشاعت
ہیڈ آفس: ۲۹ - رائٹرز کالونی ملتان فون نمبر: ۷۲۴۸۳
سب آفس: A/۳۱۶ سٹیلائٹ ٹاؤن کوئٹہ فون نمبر: ۷۱۴۲۶

چاکر خان بلوچ پبلشر نے حاجی عید احمد قادری پرنٹر ہمدرد پرنٹنگ پریس کے زیر اہتمام چھپوا کر ۲۹ رائٹرز کالونی ملتان سے شائع کیا۔

میر رسول بخش تالپور

تھم گیا کر کے بہانہ ظاہری آزار کا
دِل کہاں تک ساتھ دیتا میر کی رفتار کا

خدمتِ خلقِ خدا میں وقت سے بھی بیش بیش
اب بھی یوں لگتا ہے جیسے رُوبرو ہے میر کے ساتھ
غم کا یہ عالم ہُوا ہے زندگی میں پہلی بار!
اس قدر پیارا لیڈر تھا قبر میں بھی حشر تک
اِک دِل میں درد کی وہ ڈھیر ساری بستیاں
ہو گئیں ویران ہر مظلوم کی جائے پناہ
تالپوروں کے نسب میں وہ رئیس ابنِ رئیس
دوش پر اپنے اٹھائے ہر پرائے غم کا بوجھ
درد مندی شدّتِ جذبات تا حدِّ کمال
ہر مسافر کو ملی ہے اس کے سائے میں اماں!
قتل گاہوں میں ہوا سینہ سدا اس کا سپر
پرورشِ لوح و قلم، اہلِ قلم کی روز و شب
میں کسی صورت اسے مرحوم لکھ سکتا نہیں

ایسا طوفانی تخیّل تھا میر کے رہوار کا
ہر تجلّی پر گماں ہوتا ہے روئے یار کا
فکر کو یارا نہیں ہے جرأتِ اظہار کا
بوسہ لیتی ہی رہے خاکِ وطن، رخسار کا
تنگ جن کے واسطے آغوش ہو کہسار کا
ہائے وہ معدوم ہونا نخلِ سایہ دار کا
اِک نمونہ بے بدل محنت کشوں کے پیار کا
ایک تنہا قافلہ تھا عرصۂ پیکار کا
کس قدر نایاب اک پیکر تھا وہ ایثار کا
روٹھ جانا اُس سے جب سایہ ہر اِک دیوار کا
رُخ کسی کی سمت ہو اہلِ ستم کے وار کا
تھا اگرچہ خاندان اس کا دھنی تلوار کا
تھا وُہ اک سیلِ رواں پائندہ جوئے بار کا!

اور کیا انعام دے سکتا تجھے نذرِ سپاس!
نظم و کالم کے سوا رکھا ہی کیا ہے اس کے پاس

(انعام دُرّانی)

ایک بڑا آدمی مر گیا!

افسوس! تم کو میر سے صحبت نہیں رہی !

چاکر خان بلوچ۔ ملتان

پاکستان کے ممتاز اور بزرگ سیاستدان الحاج میر علی احمد خان تالپور گزشتہ دنوں لندن میں انتقال کر گئے۔ ان کی میت کو حیدر آباد میں ان کے آبائی قبرستان گنجی ٹکر میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کی وفات سے پورے ملک میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ اور اسے قومی نقصان قرار دیا گیا اور حیدر آباد میں تو ماتم برپا ہو گیا۔ کیونکہ میر برادران (مرحوم میر رسول بخش خان تالپور اور مرحوم میر علی احمد خان تالپور) کو حیدر آباد کے عوام اپنا محسن اور بزرگ خیال کرتے ہوئے ان سے بے پناہ محبت اور پیار کرتے تھے۔ میر علی احمد خان تالپور سیاسی طور پر احرار اور خاکسار تھے۔ انہوں نے اپنی پوری جوانی میں انگریز سامراج کے خلاف چلنے والی تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا اور طویل قید و بند سے دوچار ہوئے۔ عوام سے بے حد پیار کرتے تھے، اور ان کے حقوق کے لیے ہر آمر کے خلاف سینہ سپر رہتے۔ وہ بے حد خوددار اور بہادر اور کھرے آدمی تھے۔ جھوٹ، خوشامد اور منافقت سے واسطہ نہ تھا۔ وہ سیاست کو عبادت کا درجہ دیتے تھے جس میں حرص و ہوس، طمع اور لالچ اور بے ایمانی اور بددیانتی کو روا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی لیڈروں میں سے تھے۔ لیکن بھٹو دور حکومت میں بعض سیاسی اختلافات کے سبب پارٹی سے علیحدہ ہو گئے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی میر رسول بخش خان تالپور نے گورنری کو لات مار دی۔ اور بعد میں حکومت کے ہر غیظ و غضب کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اس سے قبل وہ ایوب آمریت سے برسرپیکار رہے اور کئی بار جیلوں میں گئے۔ ان کے ہر سیاسی اقدام میں ان کے چھوٹے بھائی شیر سندھ میر رسول بخش خان تالپور ان کے شانہ بشانہ ہوا کرتے تھے۔ یہ دونوں میر، یہ دونوں بھائی ایک جان دو قالب کی حقیقی تعبیر دکھائی دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ میر رسول بخش خان تالپور کے غم نے میر علی احمد خان تالپور کو اندر سے چاٹ کر کے موت سے ہمکنار کر دیا۔ بلاشبہ ایسے صدق اور صفا کے بندے کبھی کبھی اتارے جاتے ہیں اور ان کی کمی مدتوں تک محسوس کی جاتی رہے گی۔

میر صاحب مرحوم ون یونٹ کے زمانے میں مغربی پاکستان کے تین سال تک وزیر رہے اور بعد میں موجودہ حکومت میں آٹھ سال سے زائد عرصہ تک وزیر دفاع رہے۔ لیکن ان پر کسی کو آج تک انگلی اٹھانے کی جرات نہیں ہوئی۔ وہ اپنے آپ کو مناصب اور رتبے کے تابع نہیں کرتے تھے۔ نتیجے میں اقتدار کے اندر تھے یا اقتدار سے باہر تھے ان کے مزاج میں ان کے برتاؤ میں، ان کی معیت اور

عجز و انکساری اور ان کے میل ملاپ میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ عوام دوستی کا یہ عالم تھا کہ پورے سندھ میں وہ "وڈے میر صاحب" کہلاتے تھے۔ حیدرآباد کے تو وہ "مائی باپ" تھے۔ جس کسی کو کوئی تکلیف ہوتی۔ یا ضرورت پیش آتی۔ وہ میر صاحب کے گھر بے تکلفانہ جا کے انکی خدمات حاصل کرتا تھا۔ اور اس میں کبھی بھی سندھی اور غیر سندھی کی تمیز نہیں ہوتی تھی۔ ان کی مجالس میں انسانوں کا احترام کیا جاتا تھا وہاں انسانوں کو مہاجر، سندھی بلوچ اور پٹھان کے پیمانے سے دفن نہیں کیا جاتا تھا۔ اسی لیئے تو یہ سب لوگ ان کی موت پر نوحہ کناں دکھائی دیتے ہیں۔ میر صاحب نہایت خوش پوشاک اور خوش مزاج شخصیت تھے۔ ان کی محفل میں علم و ادب کے پھول جھڑتے تھے۔ بات بات پر شعر آتے تھے۔ قرآنی آیات آتی تھیں۔ لطیفے، ضرب الامثال، خوبصورت محاورے اور اچھی اچھی معطر یادیں مجلس کو کشت زعفران بنا دیتی تھیں۔ وہ ہر ملنے والے کو اس قدر محبت و اخلاق اور احترام دیتے تھے کہ وہ ان کا عمر بھر کے لیئے گرویدہ ہو جاتا تھا۔ میر صاحب سیاستدان تو تھے ہی۔ علم و ادب کے بھی بہت بڑے شیدائی تھے۔ بڑے بڑے عالموں، ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں سے گہری راہ و رسم رکھتے تھے انہیں قدیم اور نایاب کتابیں اور نادر قلمی نسخے جمع کرنے کا جنون تھا۔ ان کی شاندار لائبریری پاکستان کی چند صفحہ اول کی ذاتی لائبریریوں میں شمار ہوتی تھی۔ الغرض میر صاحب ہمہ صفت اور جامع شخصیت رکھتے تھے۔

وہ ایک درویش آدمی تھے۔ ان کو سیاست، تاریخ، ادب اور مذہب پر عبور حاصل تھا۔ قرآن شریف (بقول لیکھ) کو انہوں نے چوالیس بار مختلف تفاسیر کے ساتھ پڑھا۔ اور خاص طور پر اپنے ایام اسیری میں جب وہ ایک قسط میں ساڑھے چار سال قید و بند رہے۔ وہ عموماً قرآن مجید کا خلاصہ "انسانوں سے محبت" بتلایا کرتے تھے۔ اس لیئے ان کی اپنی زندگی انسانوں کی خدمت میں گذری تھی۔ وہ بلوچ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیئے بلوچوں سے محبت فطری بات تھی۔ ایوب دور میں یا اس کے بعد بھٹو دور حکومت کے آخر تک بلوچستان سے جتنے بھی سیاسی قیدی حیدرآباد جیل میں آئے۔ میر برادران نے ان کی بے پناہ خدمت کی۔ حتیٰ کہ ایوبی دور میں جب نواب نوروز خان اور ان کے چھ ساتھیوں کو حیدرآباد و سکھر کی جیلوں میں پھانسی دے دی گئی تو یہی میر لوگ تھے۔ جو لاشوں کے وارث بنے اور انہوں نے شہیدوں کو اپنے باغ میں لاکر نماز جنازہ کرایا اور شہداء کو اپنے انتظام پر بلوچستان پہنچایا۔ بلکہ مرحوم میر رسول بخش خان تالپور خود بھی ساتھ گئے۔

یہی وجہ ہے کہ بلوچستان کے عوام میر صاحبان کا بیحد احترام کرتے ہیں۔ خدا کرے یہ بلوچی جذبے اور بلوچی رشتے ان کی اولادیں قائم اور برقرار رکھ سکیں۔ اور اس گھر کے شرف میں اضافہ کا سبب بنیں۔ آپ کے بڑے صاحبزادے میر نبی بخش تالپور بیحد شریف آدمی ہیں۔ جو زمینداری کرتے ہیں۔ اور اپنے چچا زاد بھائی میر رفیق احمد خان تالپور (مرحوم میر رسول بخش خان تالپور کے اکلوتے صاحبزادے) کے ساتھ مل کر اپنے ہیڈ کوارٹر حیدرآباد میں عوامی خدمت کی خاندانی روایت زندہ رکھے ہوئے ہیں میر صاحب کے دوسرے صاحبزادے میر حیدر علی خان تالپور حیدرآباد سے سندھ اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ وہ اسمبلی کے اندر اور اسمبلی کے باہر لوگوں کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔ جبکہ ایک صاحبزادے میر محمد علی خان تالپور مدتوں سے بلوچ بن گئے اور ان کی شکل دیکھنے کو ماں باپ ترس ترس کے خدا کو پیارے ہوگئے۔

(باقی ص ۴۰ پر)

میر علی احمد خان تالپور

ایک عہد ساز شخصیت تھے : مختار عاقل

میر رسول بخش خان تالپور کے بعد ان کے بھائی میر علی احمد خان تالپور بھی چل بسے۔ میر برادران نے مل کر سندھ کی سیاست کو ایک نیا رُخ دیا تھا۔ وہ سیاست کو وڈیروں اور اوطاقوں سے نکال کر گلیوں اور چوپالوں میں لائے تھے۔ حیدرآباد کے رکشہ اور تانگے والے، ٹھیلے والے اور غریب و بے سہارا باشندے آج بھی میر برادران کی شفقت و محبت میں رطب اللسان ہیں اور میر برادران کی رحلت سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ سروں سے سایہ کھسک گیا ہے۔

میر علی احمد خان تالپور ملک بھر کے ان چند گنے چنے سیاستدانوں میں سے تھے۔ جنہوں نے اپنے بھائی میر رسول بخش خان تالپور کے ساتھ مل کر ہمیشہ اصولوں کی سیاست کی۔ اور جہاں اصولوں پر آنچ آنے لگی، اپنا راستہ تبدیل کر لیا۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز علامہ مشرقی کی زیر قیادت خاکسار تحریک سے ہوا۔ تحریک کے پرجوش سپاہی کی حیثیت سے انہوں نے برصغیر کے طول و عرض کے دورے کیے۔ اور آزادی کے لیے مسلمانوں کے لہو کو گرمانے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ فن خطابت کے دھنی تھے۔ شعلہ نوائی ان کی خصوصیت تھی۔ اور الفاظ و محاورات کے استعمال سے بخوبی واقف تھے۔ خاکسار تحریک کے پرجوش سپاہی کی حیثیت سے انہوں نے سندھ کے مختلف سیاستدانوں کو خطوط بھی لکھے۔ پشاور میں خاکسار تحریک کے تربیتی کیمپ کے بعد انہوں نے جی ایم سید کو بھی ایک خط لکھا تھا جس میں اسلام کے لیے ان کی تڑپ اور لگن کا بھرپور اظہار تھا۔ اس خط میں انہوں نے جی ایم سید سے اپیل کی تھی۔ کہ وہ اسلام کا بول بالا کرنے اور مسلمانوں کو آزادی دلانے کے لیے خاکسار تحریک میں کام کریں۔ غالباً یہ میر علی احمد خان تالپور کے خطوط کا اثر ہی تھا، کہ جی ایم سید نے خاکسار تحریک کے لیے بھی کام کیا۔ میر علی احمد خان تالپور نے اپنے وسیع سیاسی رابطوں اور عوامی کاموں کے باعث ۱۹۳۷ء میں پہلی مرتبہ حیدرآباد سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور انہوں نے اسمبلی کی سطح پر جی ایم سید اور دیگر رفقاء کے ساتھ مل کر تحریک آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۴۶ء میں وہ دوبارہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے عبدالستار پیرزادہ اور ایوب کھوڑو کی مسلم لیگی وزارت کے دور میں حزب اختلاف کا کردار ادا کیا۔ ون یونٹ کی تشکیل کے بعد جب ڈاکٹر خان نے کابینہ بنائی تو میر علی احمد خان تالپور نے اس میں وزارت خوراک و زراعت کی ذمہ داری سنبھالی اس وقت ملک میں سیاسی انارکی عروج پر تھی۔ اور سیاسی و معاشی استحکام مفقود ہو چکا تھا۔ میر علی خان تالپور نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ملک کو جمہوری ڈگر پہ ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن اکتوبر ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء نافذ ہو گیا اور تمام سیاسی سرگرمیاں معطل کر دی گئیں ـــــ

صدر ایوب خان نے ۱۹۶۲ء میں انتخابات کرائے تو میر علی احمد خان تالپور مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ لیکن انہوں نے ایوب خان کا ساتھ دینے کی بجائے محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اور ایوب آمریت کے خلاف ڈٹ گئے۔ یہاں سے ایک نئے آزمودہ کار اور پختہ سیاستدان کی حیثیت سے وہ منصۂ شہود پر آئے۔ انہوں نے اپنے بھائی میر رسول بخش خان تالپور کے ساتھ مل کر مادرِ ملت کی انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور عوام کو ایک نیا حوصلہ دیا اور آمریت کے خلاف اس جدوجہد میں انہوں نے عوامی جلسوں سے خطاب کا جو اسلوب اختیار کیا۔ وہ مستقبل کے سیاستدانوں کے لیے مشعلِ راہ بنا۔ ذوالفقار علی بھٹو خطابت کے اسی انداز کو اختیار کر کے عوام میں مقبول ہوئے۔ وہ اپنے حریف کو براہِ راست مخاطب کر کے للکارتے تھے۔ ان کی آواز آج بھی فضاؤں میں گونج رہی ہے۔ حاکمِ وقت کو للکارنے کے لیے جس جذبے اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ میر علی احمد خان تالپور میں بدرجہ اتم تھا۔ محترمہ فاطمہ جناح کی شکست کے بعد بھی میر برادران نے ہمت نہیں ہاری۔ اور جب ذوالفقار علی بھٹو ایوب خان کی وزارت چھوڑ کر میدان میں نکلے تو میر برادران ان کے ہمرکاب تھے۔ انہوں نے زیڈ اے بھٹو کے لیے اس وقت اپنے گھر کے دروازے کھولے جب

میر علی احمد خان تالپور —— ہر آمریت کو چیلنج کرتے رہے!

ایوب خان کے انتقام کے خوف سے دوسرے دروازے ملک بھر میں ان پر بند تھے۔ حیدرآباد میں ٹنڈو میر محمود میں واقع میر برادران کی رہائش گاہ کو اعزاز بھی حاصل ہے۔ کہ یہاں پیپلز پارٹی کا پہلا کنونشن منعقد ہوا۔ یہ آزمائش کے لمحات تھے۔ ایوب خان دس سالہ "عشرہ ترقی" منا رہے تھے۔ اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا۔ کہ امورِ مملکت پر ان کی مکمل گرفت ہے۔ ان حالات میں ایوب خان کی مخالفت مول لینا آسان کام نہیں تھا۔ لیکن میر برادران خم ٹھوک کر ذوالفقار علی بھٹو کی حمایت میں آگے آگئے۔ اور اپنے عوامی اثر و رسوخ کے ذریعے پارٹی کی تنظیم سازی میں نمایاں کردار انجام دیا۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں میر علی احمد خان تالپور ضلع بدین کی اس نشست پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے جو ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے جیتنے کے بعد خالی کی تھی۔ مرحوم بھٹو نے حکمتِ عملی کے تحت انہیں انتخابی عمل سے الگ رکھا تھا۔ تاکہ وہ پورے سندھ میں انتخابی مہم کی نگرانی کر سکیں۔ ان انتخابات میں ان کے بھائی میر رسول بخش خان تالپور حیدرآباد سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور بعد ازاں صوبے کے گورنر بنائے گئے۔ لیکن ان کی فطرت میں اصولوں کی قیمت پر سمجھوتہ نہیں تھا۔ گورنری اور پیپلز پارٹی انہیں زیادہ عرصہ راس نہ آئی۔ اور وہ اس "دلدل" سے باہر نکل آئے۔ میر رسول بخش خان تالپور مرحوم کے گورنری سے استعفیٰ کا سبب وہ خط بھی جو ان کے بھائی میر احمد خان تالپور نے انہیں لندن سے تحریر کیا تھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ:

"ہم نے ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ مل کر عوامی مارشل لا کی نوکری کے لیے جدوجہد نہیں کی تھی۔ ہم تو عوامی جمہوریت کے لیے کوشاں تھے۔" بھائی کے اس خط نے کچھ ایسا اثر دکھایا۔ کہ میر رسول بخش خان تالپور گورنری سے علیحدہ ہو گئے!

(باقی صـ ۳۷ پر)

میر علی احمد خان تالپور

ایک باغ و بہار شخصیت جو تہہ خاک ہو گئی :- الیاس شاکر

میر علی احمد خان تالپور کی زندگی کا بیشتر حصہ ذوالفقار علی بھٹو کی مخالفت میں گذرا لیکن اتفاقات زمانہ تو دیکھئے کہ خود میر علی احمد خان تالپور کا انتقال مرحوم بھٹو کی آٹھویں برسی کے اگلے روز ہوا۔ اس طرح اب ملک میں دو نامور سیاستدانوں کی برسیاں ۴ اپریل اور ۵ اپریل کو ہوا کریں گی۔ میر علی احمد تالپور سندھ کی سیاست میں دانشورانہ انداز سیاست کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ پڑھ لکھ کر سیاست کرنا اور تیاری کے ساتھ تقریر کرنا ان کی عادت تھی۔ میر علی احمد خان تالپور ایک بڑی ذاتی لائبریری کے مالک تھے اور ان کی بہت سے لوگوں سے دوستیوں کا آغاز کتابوں کی دکان سے ہوا تھا۔

میر علی احمد خان تالپور ایک باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، خوبصورت جملے بولنا، قصے سنانا، دوستیاں نبھانا ان کی زندگی کا ایک حصہ تھا۔ پاکستان کا درد ان کے سینے میں سمایا ہوا تھا۔ وطن کی محبت پر وہ کسی کو بھی ترجیح نہیں دیتے تھے پاکستان کو مستحکم کرنے کی باتیں ان کی زبان پر رہتی تھیں۔ میر علی احمد تالپور کہتے تھے کہ وہ ایوب خان کی ڈکٹیٹرشپ کے اس لیئے مخالف ہیں کہ ایوب خان ملک کو "تانگے کی طرح چلانا چاہتے تھے۔ اور ہمارا یہ کہنا تھا کہ عوام پر چابک مار کر حکومت نہیں کی جاسکتی۔ عوام پر محبت کے ساتھ حکومت کرنی چاہیئے میر علی احمد تالپور کی متعدد خصوصیات تھیں۔ وہ بے خوف ہو کر گفتگو کرتے تھے۔ انہیں خود احتسابی کا بھی فن آتا تھا۔ خوشامد کے وہ مخالف تھے لیکن جب انکے انداز خطابت کی بات کی جاتی تھی تو وہ بالکل ایک نارمل انسان کی طرح استفسار کرتے تھے۔ کہ آپ کو میری تقریر کی کونسی بات پسند آئی؟ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے میرا یہ تجربہ ہے کہ میر علی احمد خان تالپور ملک کے ان گنے چنے چند افراد میں سے ایک تھے جن سے جب بھی انٹرویو کیا، اور گفتگو کی انہوں نے نئی باتیں کیں۔ پاکستانی سیاستدانوں کو یہ فن بہت کم آتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف میر علی احمد خان تالپور کے انٹرویو میں اتنی سرخیاں ہوتی تھیں، کہ لکھنے والا محسوس کرتا تھا کہ وہ پورا انصاف نہیں کر سکا۔ جب غلام مصطفٰے جتوئی نے اپنی نئی پارٹی — نیشنل پیپلز پارٹی بنائی۔ اور اس پر میر علی احمد تالپور کا ردعمل پوچھا تو انہوں نے کہا کہ "ہم ہر ڈھول بجانے والے کے ساتھ ناچ نہیں سکتے"

ایوب خان کی آمریت کے خلاف — سندھ میں بھرپور جدوجہد کرنے والوں میں میر برادران (میر علی احمد خان تالپور اور میر رسول بخش خان تالپور) کا نام ہمیشہ نمایاں رہا۔ ایک وقت ایوب کے ساتھ ایوب کے خلاف صف آرا تھے۔ اور اپنے حامیوں کے حوصلوں کو بڑھانے کیلیے جلسوں میں اشعار پڑھتے تھے۔ وہ منفرد انداز خطابت کے مالک تھے۔ جب وہ تقریر کرتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ جوش کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ خاص طور پر "عوامی جلسوں" میں کسی خاص بات کو تین بار دہرانے کے فن کے خالق تھے۔ آج کل یہ

اندازِ خطابت آنسہ بے نظیر بھٹو نے اپنا رکھا ہے۔ سندھ کی ہواؤں میں میر علی احمد خان تالپور کی یہ آواز آج بھی گونج رہی ہے ،،

"او!! ایوب خان ۔۔ تجھے ہم اقتدار سے ایک دن بھگا دیں گے ۔ بھگائیں گے ۔ بھگائیں گے ۔ "

میر برادران کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح اپنی انتخابی مہم کے دوران ۱۹۶۴ء میں ان کی مہمان رہ چکی ہیں۔ اور جب ۱۹۶۶ء میں ذوالفقار علی بھٹو وزارتِ خارجہ سے مستعفی ہو کر حیدر آباد پہنچے۔ تو اس ہوٹل کے مالکان نے بھٹو کو ایوب خاں کے خوف سے کمرہ کرایہ پر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جس کا افتتاح خود ذوالفقار علی بھٹو نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے کیا تھا۔ جب یہ اطلاع میر برادران کو پہنچی۔ تو انہوں نے بھٹو کو پیغام بھیجا کہ "اگر تم مصیبت میں ہو تو ہمارے گھر کے دروازے تمہارے لیئے کھلے ہوتے ہیں۔" اور میر برادران کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ پیپلز پارٹی کا پہلا کنونشن ان کے آبائی گاؤں میر گا رڈن میں ہی منعقد ہوا جب ایوب خانی انتظامیہ نے اس کنونشن کو ناکام کرنے کی بھرپور سعی کی تھی۔ اس کے باوجود بھی میر برادران کی جرأت و استقامت کے باعث یہ کنونشن منعقد ہوا۔ لیکن جب یہی ذوالفقار علی بھٹو اقتدار میں آئے تو میر برادران نے جلد ہی وزیر اعظم بھٹو کے لیے ۔۔ اپنے گھر کے دروازے بند کر لیئے۔ ان کا ہمیشہ یہ کہنا تھا۔ کہ "ہم نے ظلم اور بربریت کا دور لانے کے لیئے جدو جہد نہیں کی تھی۔ ہم تو عوامی جمہوریت کے لیے کوشاں تھے۔" وہ پیپلز پارٹی کے صفِ اول کے لیڈر رہے۔ جنہوں نے بھٹو کے عوامی مارشل لاء کی مخالفت کی تھی۔ اور کہتے تھے۔ کہ پیپلز پارٹی کو عوام نے اس لیے ووٹ نہیں دیئے تھے۔ کہ ہمارے چیئرمین صاحب سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بن جائیں۔ میر علی احمد تالپور کے انہی نکات سے بھرپور خط کا پہلا ردعمل یہ ہوا کہ میر رسول بخش خان تالپور نے سندھ کی گورنری سے استعفیٰ دے دیا۔ اور گورنر ہاؤس کو "کوفہ" قرار دے کر زندہ سلامت واپس آگئے۔ لیکن جب یہی میر علی احمد تالپور ضیاء الحق کے مارشل لاء میں وزیر دفاع بن گئے تو بہت سے لوگوں کو حیرت ہوئی۔ کہ یہ کیا ہوا۔؟ خود میر علی احمد تالپور کا کہنا یہ ہے کہ خود انہوں نے وزارت اس لیئے قبول کی ہے۔ تاکہ بغیر کسی "المیہ" کے قوم کو پُر امن طریقے سے مارشل لاء سے نجات دلائی جائے۔ قوم کو ۸۵ء کے عام انتخابات میں مارشل لاء سے نجات تو مل گئی۔ لیکن میر علی احمد خاں تالپور مارشل لاء کو رخصت کرنے والی اسمبلی کی رکنیت حاصل نہ کر سکے۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ "میں ہارا نہیں ہوں۔ بلکہ مجھے ہروایا گیا ہے۔" اہل لاہور نے انہیں نواز شریف کی خالی ہونے والی نشست پر ضمنی الیکشن لڑنے کی پیشکش کی تھی۔ لیکن انہوں نے کہا کہ ہم عوام کے فیصلہ کو تسلیم کر چکے ہیں اور اگلے انتخابات کا انتظار کر رہے ہیں۔ لیکن ان کی اچانک موت نے انہیں مہلت نہ دی۔ ۱۹۸۳ء کی ایم آر ڈی کی تحریک کے دوران جب میر علی احمد خان تالپور کو وزیر اعظم بنائے جانے کی قیاس آرائیوں پر استفسار کیا گیا تو انہوں نے کہا۔ کہ "مجھے شہادت کا کوئی شوق نہیں ہے۔" میر علی احمد خان تالپور ہمیشہ ۱۹۷۳ء کے آئین کے مخالف رہے۔ وہ اسے "بھٹو کا آئین" کہتے تھے۔ میر علی احمد خان تالپور نے اس آئین پر دستخط کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اور کہا۔ کہ مجھے فخر ہے کہ میں نے اس

(باقی صـ ۳۹ پر)

میر صاحب — کچھ آہیں کچھ یادیں

۔ ریاض صدیقی

انسانی ہجوم میں کبھی کبھی غیر معمولی انسان پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان انسانوں کا باطن بہت صاف اور ذہن بیحد حساس ہوتا ہے یہی وہ لوگ ہیں جن پر یہ فقرہ بھی صادق آتا ہے کہ امیری میں فقیری کی۔ میر رسول بخش خان تالپور کا تعلق انسانوں کے اسی خاندان سے ہے پاکستان بننے کے بعد اب تک پُر تکلف زندگی کا لطف اٹھانے والوں نے انسان دوستی دردمندی اخوت اور مساوات کا عَلم کچھ اس طرح بلند کیا۔ کہ عام انسانوں کا ان اقدار سے اعتبار ہی اُٹھ گیا۔ یہاں تک کہ ہمارے انقلابی دانشوروں نے بھی نظریہ سازی کے ساتھ اپنا کیریر بنانے اور معیار زندگی کو دولتمند طبقوں کے برابر لانے میں کوتاہی نہیں کی۔ میر صاحب ان حالات میں اس پسماندہ خطۂ زمین کے انسانوں میں ایک نمائندہ حیثیت رکھتے تھے۔ اُن کا تعلق سندھ کے اس حکمران خاندان سے تھا جس نے کم و بیش دو سو سالوں تک اقتدار برقرار رکھا۔ یہ تاریخ میں حریت پسندوں کا وہ حکمران خاندان تھا جو پورے سو سال تک برعظیم میں انگریزوں کے خلاف نبرد آزما رہا۔ اودھ کی سرکار اور دہلی کے آخری فرمانرواکے ساتھ مل کر اس خاندان نے آزادی کی آخری جنگ لڑی۔ ۲ مئی ۱۹۸۲ء کو پاکستان کا دوسرا بڑا شہر سوگوار تھا۔ لاکھوں انسانوں کا سمندر، رونے چلانے کی آوازیں ہر طرف سے بلند ہو رہی تھیں۔ بعض تو دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ یہ سفر کا آخری مرحلہ تھا جس سے درویش صفت قلندر اور خالصتاً غریب عوام اور مزدوروں کا خیر خواہ جو خاندانی پس منظر کے باوجود فقیری میں مست رہا گذر رہا تھا یہ اس مردِ حق آگاہ کا سفر تھا جس کو سرکاری یا نیم سرکاری توجہ۔ ذرائع ابلاغ اور اونچے گھر والوں کا سہارا درکار نہ تھا۔ اس کو سہارا دینے کے لیئے اس کے اپنے لاکھوں موجود تھے۔ ان لاکھوں کو کسی نے بلایا نہیں تھا۔ بس ان کا جی خود ہی بھر آیا۔ دریا چڑھ گیا اور پھر پشتے اور بند توڑ کر خود ہی بہہ نکلا۔

چوبیس سال پہلے کی بات ہے ان دنوں ہم یونیورسٹی کے پڑھنے والوں کی دو منزلیں ہوتی تھیں ایک مرزا عابد عباس کا مسکن۔ اور دوسری میر رسول بخش خان تالپور کی خانقاہ۔ ان کی قیام گاہ کو خانقاہ کہنا ہی مناسب ہوگا۔ چند معمولی سے کمروں پر مشتمل یہ معمولی سا مکان ہے سامنے ہی پرانی وضع کی وہ عمارت ہے۔ جو ہنر اسلامی اور سندھی فنِ تعمیر کے امتزاج کا مظہر ہے۔ مکان کے ایک طرف شہر کا پاور ہاؤس ہے۔ دوسرے بازو میں بہت بڑا ویران میدان ہے۔ تیسری طرف ٹوٹتی گرتی ہوئی دیواریں اور لاہور کی طرف جانے والی ریلوے لائن اور سامنے ٹوٹی پھوٹی کچی پکی سڑکیں ہیں۔ جن کے چاروں طرف غریب عوام کی گنجان آبادبستیاں اور بازار ہیں ۱۹۶۰ء میں بھی اسی قیام گاہ کا یہی عالم تھا۔ اور آج ۱۹۸۲ء میں بھی وہی حال اور وہی رفتار ہے۔ ۲ مئی اور اس کے بعد آنے والے تمام بڑے افسروں، وزیروں، امیروں اور باہر کے ملکوں سے متعلق سفیروں کو ان راستوں ہی سے چل کر آنا پڑا۔ اس منظر کو دیکھ کر

کر بے ساختہ مصطفےٰ زیدی مرحوم یاد آ گئے ؎

میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے !

ہم طالب علم اس گھر کو خانقاہ ہی کہا کرتے تھے، کیونکہ یہاں مرحوم اکثر دری پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا کرتے تھے۔ پلنگ یا بید کم ہی استعمال کرتے تھے۔ حتیٰ کہ چیف منسٹر ہاؤس کراچی میں بھی فرشی بیڈ موجود تھا۔ ان دنوں سندھ کے ایک موجودہ وزیر اور ایک مشہور فلم ہیرو بھی اپنے دوست ہوا کرتے تھے۔ اب ان کے بارے میں کچھ لکھنا ممکن نہیں۔ کیونکہ ہمارے معاشرے میں نیچے سے اوپر پہنچ جانے کے بعد طرز فکر اور زندگی میں انقلاب آ جاتا ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ مرحوم جیسے دیوانوں کو چھوڑ کر عموماً ہمارے معاشرے میں انسانی تعلقات کی بنیادیں اسٹیٹس (STATUS) پر قائم ہوتی ہیں۔ ایک اتفاق تھا کہ سندھ سیکرٹریٹ کی لفٹ میں سامنے وہی وزیر موجود تھے۔ مگر نہ انہوں نے مجھے پہچانا۔ اور نہ میں نے یاد دلانے کی کوشش کی۔ اس قسم کا دوسرا موقع اس وقت آیا جب میں ایک کام کے سلسلے میں مرحوم سے ملنے گیا۔ مرحوم دفتر میں موجود نہ تھے۔ دفتر میں کوئی نظم و ضبط نہ تھا۔ اور کسی کو صحیح پتہ نہ تھا کہ وہ کب آئیں گے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ خود میر صاحب مرحوم کی قلندرانہ طبع اس قسم کے آداب سے انکار کرتی تھی۔ میں واپس لوٹا دیکھا تو سامنے چلے آ رہے تھے۔ میں ازراہِ مصلحت کونے میں چلا گیا۔ لیکن ان کی نظر مجھ پر پڑ ہی گئی۔ بائیس سال بعد بھی وہ مجھے پہچان گئے۔ لپک کر آگے بڑھے اور مجھ سے بھی رہا نہ گیا۔ میں ان سے لپٹ گیا۔ دیر تک حال احوال پوچھتے رہے۔ پھر کہنے لگے۔ کریم الدین سے تمہارا سارا حال معلوم کر لیا تھا۔ میرے ذہن میں غالب کا یہ شعر ابھرا ؎ لیکن تیرے خیال سے تو غافل نہیں رہا۔ اندر آ گئے۔ میں نے کہا، میر صاحب وہ خانقاہ والا مزہ یہاں نہیں۔ بولے، ایسے نہیں حضرت! ہم درویش فقیر جہاں بیٹھ گئے۔ وہ خانقاہ بن گئی۔ اور پھر مخصوص والہانہ لہجے میں کہا ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی !

میں نے عرض کیا۔ پاکستان چلڈرنز اکیڈیمی بچوں کے عالمی دن کا جشن منا رہی ہے۔ اور یہاں آپ کا ہونا ضروری ہے۔ صدارت بیگم ثاقبہ رحیم کر رہی ہیں۔ بولے بھئی آپ کی اکیڈیمی تو بڑی سرمایہ دار ہے۔ انہیں شاید اکیڈیمی کوئٹہ کا وہ جلسہ یاد آیا جس میں صدرِ پاکستان نے ادارے کو بھاری رقم پیش کی تھی۔ اور بعض دوسرے ذریعوں نے بھی کوئٹہ میں ادارے کو بڑا مال دیا تھا۔ میں نے فوراً ان کو بتایا کہ ہماری کراچی کی اکیڈیمی بالکل پھکڑ ہے۔ اور اس کو کسی قسم کا کوئی مالی تعاون کہیں سے بھی حاصل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بچوں کا سالانہ کے لیئے وفاقی وزیر تعلیم نے بچوں کے سامنے مالی مدد پر غور کرنے کا جو وعدہ ۱۹۸۰ء میں کیا تھا۔ وہ بھی پورا نہ ہوا ہم نے کنوئیں میں بالٹی تک ڈال دیئے، مگر نتیجہ وہی مایوسی، برجستہ فرمانے لگے۔ آپ اکبر کا شعر بھول گئے ؎

شیخ قرآن دکھاتے رہے پیسہ بھی نہ پایا

خوش ہو کر کہا چلو درویشی کا بھرم تو تم نے قائم رکھا۔ شرکت منظور کی۔ آغا کو بلا کر نوٹ کرا یا۔ میں نے کہا کہ رسمی دعوت نامہ جلد ہی پہنچ جائے گا۔ فوراً بولے اچھا تو اس شہر کے ماحول کا رنگ چڑھ رہا ہے۔ ارے بھائی! تم نے بھی کاروبارِ عشق چھوڑ

دیا۔ ہم فقیروں کے تو وہی آداب جنوں ہیں کہ جو تھے۔ جس نے محبت سے بُلایا آگئے۔ ان مراسلوں اور رسمی دعوت ناموں سے ہمارا کیا لینا دینا۔
۹ راکتوبر ۱۹۸۰ء کو پروگرام کے مطابق بچوں کے عالمی دن کی تقریب کو رونق بخشی۔ ہماری ایک جماعت ان کو لینے کے لیئے چیف منسٹر ہاؤس جانے ہی کو تھی۔ کہ سیاہ رنگ کی کار آ کر رُکی۔ اور میر صاحب اُتر سے تنہا تھے۔ کوئی دوسرا سوائے آغا کے ساتھ نہ تھا۔ کچھ اس طرح آئے گئے کہ بے ساختہ یہ شعر یاد آگیا ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے

میر بہ جان چھڑ کتے تھے اساتذہ میں آتش، مصحفی اور غالب کو بہت پسند کرتے تھے۔ نثر میں شبلی، مہدی، محمد حسین آزاد اور مولانا ابوالکلام کے عاشق تھے۔ لسانی خلفشار کے زمانے میں جو سلوک ان کے ساتھ ہوا تھا۔ ایک لمبی کہانی ہے۔ مرحوم اس افسوسناک اتفاق اور سیاسی شعبدہ بازی کا ذکر کر کے آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ ایک نجی محفل میں بات اُٹی تو برجستہ کہا ؎

اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

ہمارا طالب علمی کا زمانہ تھا۔ سال غالباً ۱۹۶۲ء تھا۔ تلک چاڑھی جانے والے چوراہے پر عوام کا ایک ہجوم پولیس کے نرغے میں تھا۔ اطلاع میر صاحب کو پہنچی اور چند منٹ گزرنے کے بعد وہ خود یہاں آکر پہنچے۔ اور چوراہے پر دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ بعض پولیس والے اور ڈی ایس پی ان کے احسان مند تھے۔ احسانمندی کی کہانی لمبی ہے۔ اور خود مرحوم نے اس قسم کے معاملات کو پبلک کرنے سے ہمیشہ منع کیا۔ ڈی ایس پی نے احترام کے ساتھ ان کو رام کرنے کی ہزار کوشش کی۔ مگر وہ یہی کہتے رہے کہ "جناب آپ کو حکم ملا ہے آپ حکم کی تعمیل کیجیئے۔ یہ سارے لوگ میرے اپنے گھر کے لوگ ہیں۔ میں ان سے الگ کیسے ہو سکتا ہوں"۔ آخر کار ایس پی کو مداخلت کرنا پڑی اور لاٹھی چارج کے احکامات واپس لیئے گئے۔ میر علی احمد خان تالپور قبلہ نے فرمایا۔ کہ وفات سے ایک گھنٹہ پہلے فون کیا۔ کہا بھئی آپ تو فون بھی نہیں کرتے ہیں چلیئے میں ہی کر لیتا ہوں۔ پوچھا جن آدمیوں کی فہرست دی تھی۔ ان کے کاموں کا کیا ہوا۔ جواب سے وہ مطمئن نہ ہو سکے۔ کہنے لگے کہ ان لوگوں کا کام فوراً ہونا چاہیئے۔ آخر ہم کس لیئے بیٹھے ہیں۔ پھر کہنے لگے۔ بھئی علی احمدؔ اپنے مشن کو نہ بھولو۔ میر علی احمد خان تالپور نے جواباً کہا۔ حضرت ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم اپنا مشن اور رنگ بھول گئے تو پھر رہیں گے کہاں۔ آپ مطمئن رہیئے۔ کام ہوگا۔ ضرور ہوگا۔ جنوری ۱۹۸۲ء میں سیرت کے جلسہ میں شرکت کے لیئے علامہ اقبالؒ کالج تشریف لاتے۔ اور یہاں مجھے دیکھ کر خوش ہوئے۔ تقریر فرمائی۔ کہا "یزید ایک شخص کا نہیں ایک رویئے کا نام ہے

ظلم و بربریت کا ہر مظہر یزیدیت ہے۔ اور یہ یزیدیت تاریخ کے ہر دور میں رہی ہے۔ کل بھی تھی اور ... ہمارے آپ کے ساتھ سائے کی طرح موجود"۔ اپریل ۱۹۸۲ء کے آخری ہفتے میں انہوں نے جشن محمد علی میں شرکت کی اور رات تین بجے تک جشن میں بیٹھے رہے پچھلے دو سال سے انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ پھر بھی ان کے قریبی احباب اور معالج اکثر میر صاحب کو آرام کا مشورہ دیتے تھے۔ اور رات دیر تک محفلوں میں بیٹھنے سے منع کرتے رہتے۔ محفل آرائی ان کی زندگی تھی۔ جو انہوں نے مرتے دم تک

نہ چھوڑی۔ میر علی احمد خان تالپور نے بہت کوشش کی کہ وہ رات جلدی بستر پہ جائیں۔ مگر نہ ملنے پہ کہتے تھے۔ ارے صاحب! یہ مرنا جینا اختیاری مضمون تو ہے نہیں۔ جو ہوتا ہے، ہو گا۔ علم و ادب اور شاعری ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ فارسی اردو اور سندھی ان کے گھر کی زبانیں تھیں۔ استادوں، شاعروں اور دانشوروں پر جان چھڑکتے تھے۔ آخری دنوں میں جب سردار جعفری گوپی چند نارنگ اور جگن ناتھ آزاد یہاں آئے ہوئے تھے۔ میر صاحب نے شاید ہی کوئی محفل چھوڑی ہو۔ ایک رات تو مشاعرے میں آخر وقت تک موجود رہے۔ جوش، فراق اور احسان کی موت سے ان کو بُری طرح دھچکا لگا تھا۔ ۱۹ مئی کو وعدہ فرمایا تھا کہ جلد از جلد اکادمی کے دفتر میں ہم آئینگے۔ ہم نے ۳۰ اپریل کو جو سرکلر جاری کیا۔ ان میں آپ کا نام موجود تھا۔ ۲۱ مئی کو ہم نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ان کے نام پر سفید رنگ کا لوشن پھیر کر سرکلر فوٹو اسٹیٹ کرایا۔ ہمارے سرکلر میں وہ خالی جگہ بہر حال موجود رہی۔ میر رسول بخش خان تالپور یقیناً ان گنے چنے لوگوں میں سے تھے۔ جنہیں بقول میر تقی میر آسمان صدیوں خاک چھان کر پیدا کرتا ہے۔ اور وقت ایک ہی وار میں ایسے لوگوں کو ہم سے چھین لیتا ہے۔ وہ ہماری تہذیبی علمی و فکری تاریخ اور برعظیم میں گذرنے والے عظیم المرتبت اہل اللہ کی تحریک کے روشن چراغ تھے۔

میر رسول بخش خان تالپور کی وفات سے سندھ میں محبتوں اور عقیدتوں کا ایک علم سا نگوں ہو گیا ہے وہ ایک قد آور شخصیت تو تھے ہی لیکن صوبہ سندھ میں انہیں خصوصیت کے ساتھ نئے اور پرانے سندھیوں کے درمیان ایک مستحکم رابطے کی حیثیت سے حاصل تھی وہ سندھی ثقافت کا نمونہ تھے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نئے سندھیوں سے ان کے انس گہرے رشتے قائم تھے۔ جامعہ ملیہ دہلی کی تعلیم نے انہیں برصغیر کے تمام مسلمانوں کی امنگوں سے آشنا کر دیا تھا۔ سندھ کے سینئر وزیر کی رہائش گاہ میں اُن کے دم سے بڑی رونقیں تھیں وہ بلا امتیاز سب کے لیے گرمجوشی کا دریا رواں تھا۔ ایسی محبوب انسانیت شخصیت کی اچانک وفات کچھ اتنا بڑا نقصان ہے کہ نہ اس کا احاطہ کرنا آسان ہے اور نہ آنے والے برسوں میں اس کے ازالے کی کوئی صورت نظر آتی ہے۔ انکے بچھڑ جانے سے ملک ایک ایسے چہیتے اور دور اندیش سے محروم ہو گیا جن کے سائے کی آغوش سب کے لیے بہت کشادہ تھی وہ انسان کی بڑائی کے قائل ہی نہیں تھے بلکہ اسکے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے کو فرض بھی تصور کرتے تھے انکی انہی عادتوں نے انہیں ایک محبوب شخصیت بنا دیا تھا شاید یہی سبب ہے کہ انکی وفات کا صدمہ ہر ایک گھر میں محسوس کیا گیا اور اسی لیے ہم وزیر کا تقاضہ ہے کہ حیدر آباد اور کراچی میں ان کے شایان شان کوئی یادگار ضرور قائم کی جانی چاہیے!! (اداریہ "اخبار جہاں")

اُٹھو کہ محفل دُنیا سے تالپور اُٹھے ، اب ایسا غازیٔ عزم و عمل ملے نہ ملے
شریف دوست، عوام آشنا، ادیب نواز ، رسول بخش کا نعم البدل ملے نہ ملے

بقیہ :- میر علی احمد خان تالپور، عہد ساز شخصیت

میر علی احمد خان تالپور پیپلز پارٹی سے اختلافات کے بعد لندن میں رہائش پذیر رہے۔ انہوں نے ۱۹۷۳ء کے آئین پر دستخط نہیں کیے تھے۔ وہ اسے بھٹو کا درباری آئین" کہا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ۱۹۷۳ء کا آئین عوام کی بجائے وزیر اعظم کو سجدہ کرتا ہے۔ اور مرحوم بھٹو نے اسمبلی میں ان پر زور ڈالا کہ وہ آئین پر دستخط کرنے کی سعادت سے محروم نہ ہوں۔ تو میر علی احمد خان تالپور نے جواباً کہا تھا۔ کہ میں اس گناہ میں آپ (بھٹو) کا شریک نہیں بننا چاہتا۔ ایک مرتبہ انٹرویو کے دوران میر علی احمد خان تالپور راقم الحروف سے کہنے لگے "اگر بھٹو ہماری بات مان لیتے تو انہیں پھانسی نہیں ہوتی۔ ۱۹۷۳ء کا آئین اپنے خالق کا دفاع کرنے کی صلاحیت سے محروم تھا۔"

لیکن ذوالفقار علی بھٹو کی زیر قیادت پیپلز پارٹی کی سیاسی حکومت کے کٹر مخالف میر برادران ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے بعد جب ۱۹۷۹ء میں صوبائی اور وفاقی وزارتوں میں شامل ہو گئے اور میر علی احمد خان تالپور نے وزارت دفاع کا قلمدان سنبھالا تو بہت سے حلقوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ میر صاحبان تو ہمیشہ جمہوریت کے لیے جدوجہد کرتے آئے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ عوامی امنگوں اور تحریک کی ترجمانی کی تھی۔ پی پی پی کے دور حکومت میں بلوچستان پر فوج کشی ہوئی تو میر برادران بلوچوں کے ہمراہ تھے۔ ولی خاں پر حیدر آباد ٹریبونل میں "سازش کیس" تو میر برادران کے گھر سے حیدر آباد سینٹرل جیل میں سازش کیس کے اسیروں کے لیے کھانا جایا کرتا تھا۔ ۱۹۷۷ء میں عوامی تحریک چلی تو وہ عوام کے شانہ بشانہ کھڑے تھے۔ اور انہیں اس مخالفت کی پاداش میں اپنے ایک عزیز میر فیض تالپور کے قتل کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ حیدر آباد میں ہونے والے پی پی پی اور پی این اے کے جلسوں میں بھٹو اور میر برادران کے درمیان ہی دو بدو تکرار ہوئی تھی۔ لیکن جمہوری جدوجہد میں ثابت قدمی کا شاندار ریکارڈ رکھنے کے باوجود آخر وہ مارشل لاء حکومت کا ساتھ دینے پر کیوں آمادہ ہوئے۔؟ اس "کیوں" کے جواب میں میر علی احمد خان تالپور عموماً ایک ہی جواب دیتے تھے۔ "میں نے وزارت صرف ایک ہی جذبے کے تحت قبول کی ہے۔ کہ کسی طرح قوم کو دوبارہ جمہوریت کے راستے پر گامزن کیا جائے۔ اور قوم کو بغیر کسی "المیہ" کے پُرامن طور پر مارشل لاء سے نجات دلائی جائے۔" وزارت ملنے کا احوال بھی بڑا دلچسپ ہے۔ وزارت دفاع کی ذمہ داری تفویض کرنے سے قبل جب ان کی مرضی معلوم کرنے کے لیے ان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔ تو ان کا ٹیلیفون خراب تھا جس کے بعد متعلقہ حکام "وائر لیس سیٹ" لے کر مسلم آباد میں واقع ان کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ کہ صدر مملکت آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میر علی احمد خان تالپور نے کہا کہ جب ٹیلیفون ٹھیک ہو گا تو وہ بات کر لیں گے بعد ازاں صدر جنرل محمد ضیاء الحق کی خصوصی ہدایت پر ٹیلیفون درست ہوا تو صدر سے ان کی گفتگو ہوئی۔

میر علی احمد خان تالپور نے فروری ۱۹۸۵ء کے عام انتخابات میں حصہ لینے کے لیے انتخابات سے قبل وزارت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے حیدر آباد کی نشست پر قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا۔ لیکن ان کے مقابلے پر قاضی عبدالمجید عابد کامیاب ہو گئے۔ انہیں صدر جنرل ضیاء الحق کا "اوپننگ بیٹسمین" قرار دیتے ہوئے پیپلز پارٹی نے بھی ان کے خلاف بھرپور مہم چلائی۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے ۲۷ ہزار ووٹ

حاصل کیئے۔ اپنی شکست کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ وہ ہارے نہیں ہیں۔ بلکہ انہیں ہروایا گیا ہے۔ ایک مرتبہ اخبار نویسوں نے ان سے شکست کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے یہ شعر پڑھ دیا:

ہم تو زخمی ہی ہوئے، خیر ہوئی عشق میں جان چلی جاتی ہے!

ان کے قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ میر علی احمد خان تالپور کو یہ قلق تھا کہ ان کی شکست میں خود حکومت نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ میر علی احمد خان تالپور اطوار حکومت سے مطمئن نہیں تھے۔ اور وہ ملک کو مکمل جمہوریت کی ڈگر پر ڈالنے کے لیئے لائحہ عمل مرتب کر رہے تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے سندھ کے مختلف علاقوں کے دورے بھی کیئے اور اپنے سیاسی ہمنیال دوستوں سے رابطہ قائم کیا تھا۔ صدر ضیاء الحق کی مخالفت میں تحریک چلانے کے بارے میں وہ کہتے تھے۔ کہ کوشش کے باوجود وہ خود کو صدر ضیاء الحق کی مخالفت پر تیار نہیں کر سکے۔ وہ ایک با اخلاق انسان ہیں اور تقریبات میں دور سے ہی دیکھ کر اس محبت کے ساتھ آکر ملتے ہیں۔ کہ مخالفت کا خیال ترک کرنا پڑتا ہے۔ میر برادران خود بھی محبتوں اور دوستی کا بہتا ہوا چشمہ تھے جس سے ان کے قریب آنے والا ہر شخص فیضیاب ہوتا رہا ہے ان کا فلسفہ سیاست ہی یہ تھا کہ ہم سیاست میں خدمت کرنے اور گھر سے کچھ دینے آئے ہیں، لینے کے لیئے نہیں آئے۔ ایک مرتبہ گھر کے درو دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ہم وزارتوں میں رہ کر بھی اپنے گھر کی دیوار و در پر رنگ و روغن نہیں کرا سکے وہ پاکستان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ مارچ ۱۹۸۶ء میں سن، میں جی ایم سید کی سالگرہ کے موقعہ پر وہ ممتاز علی بھٹو اور مسلم لیگی رہنما ہارون احمد کے ہمراہ اسٹیج پر براجمان تھے۔ جب پاکستان کی مخالفت میں پیش کی گئی قرارداد کی منظوری کے لیے ہاتھ اٹھوائے گئے تو میر علی احمد تالپور کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوئے اور ممتاز بھٹو اور ہارون احمد کے ساتھ انہوں نے بھی قرارداد کی حمایت میں ہاتھ نہیں اٹھایا۔ وہ وطن کی خدمت کے جذبے سے سرشار تھے اور چاہتے تھے کہ اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر ملکی سیاست میں مؤثر کردار انجام دیں لیکن زندگی نے وفا نہیں کی اور ۵ اپریل ۱۹۸۷ء کی شب لندن کے اسپتال "لندن کلینک" میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

میر علی احمد خان تالپور بلند پایہ سیاستدان، محبِ وطن اور منکسر المزاج انسان کے علاوہ علم و ادب کے بھی شیدائی تھے۔ ان کی گفتگو میں اشعار اور قرآنی آیات کی چاشنی شامل ہوتی تھی۔ جو دلوں کو مسحور کر لیتی تھی۔ ان کی ذاتی لائبریری میں ہزاروں کی تعداد میں نادر و نایاب کتب موجود ہیں اور سندھ کی چند شخصی لائبریریوں میں ان کا شمار بھی ہوتا ہے وہ ان دنوں ذاتی تجربات پر مشتمل کتاب قلم بند کرنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے لیکن قسمت نے اسکی مہلت نہیں دی۔ میر رسول بخش خاں تالپور کے بعد میر علی احمد خاں تالپور جیسی باغ و بہار اور پر جوش سیاسی شخصیت کی رحلت ایک بڑا قومی نقصان ہے۔ جسے پر کرنے کے لیئے اسی خاندان کے چشم و چراغ میر رفیق تالپور، میر نبی بخش تالپور اور میر حیدر علی تالپور کو اپنا فرض نبھانا اور عوامی خدمت کا قلمدان سنبھالنا ہوگا۔

بقیہ:- تالپور

میر صاحب ہمیشہ ظلم و بربریت کیخلاف سینہ سپر رہے!

"درباری آئین پر دستخط نہیں کیئے۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ ۱۹۷۳ء کا آئین عوام کی بجائے وزیر اعظم کو سپرد کرتا ہے جو وزیر اعظم بھٹو نے تشکیل آئین کے آخری روز میر علی احمد خان تالپور سے کہا کہ "یہ ملک کا تاریخی آئین ہے۔ آپ دستخط کرنے کی سعادت سے محروم نہ ہوں۔" تو جواب میں میر علی احمد خان تالپور نے کہا کہ "میں اس لیئے دستخط نہیں کر رہا۔ کہ" میں اس گناہ میں آپ کا شریک نہیں ہوں۔"

میر علی احمد خان تالپور ملک کے ان چند وزراء میں سے ایک تھے جنہیں ان کی وزارت کے اثاث نے الوداعی استقبالیہ دیا۔ اس موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے اپنی انتخابی شکست کو یاد رکھا اور یہ شعر پڑھا ؎

ہم تو زخمی ہوئے، غنیمر ہوئی
عشق میں جان چلی جاتی ہے!

بقیہ :- بڑا آدمی مر گیا -!

اگرچہ میر علی احمد خان تالپور اور میر رسول بخش خان تالپور کے مقام و مرتبہ تک رسائی بہت مشکل ہے۔ تاہم یہ بات اطمینان بخش ہے کہ ـــــ مرحوم میروں کے جوانسال فرزندان میر نبی بخش خان، میر حیدر علی خان، اور میر رفیق احمد خان نے اپنے بزرگوں کے سماجی، سیاسی، اور تہذیبی و ثقافتی ورثہ کی صحیح طور سے پاسداری کر رہے ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ سب خلیق و ملنسار نوجوان ہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ ان نوجوانوں کو اپنے بزرگوں کی قومی روایات کے تحفظ کی توفیق ہو۔ ان کو مرحوم میروں الیسی جرأت و بہادری، حق گوئی و عوام دوستی اور سامراج دشمنی کی طاقت ہو۔ ہم خواہش کرتے ہیں کہ بڑے میروں کے زمانے میں ان کے گھر کو "بلوچوں کے گھر" ہونیکی جو فضیلت حاصل رہی ہے۔ وہ بلوچی رشتے، بلوچی محبتیں، بلوچی خیر خواہی اور بلوچی دوستی و یگانگی کے جذبے قائم اور موجزن رہیں۔ ہم اپنے عظیم محسن اور بہترین بلوچ بزرگ الحاج میر علی احمد خان تالپور کی تعزیت کے لیے قدرے تاخیر سے حیدر آباد جاسکے یکم مئی کو مرحوم میر رسول بخش خان تالپور کی برسی بھی تھی۔ ہم نے دونوں اکابرین کی قبروں پر حاضری دی۔ میر نبی بخش خان تالپور نے اپنی ملاقات میں اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ کراچی میں میر صاحب کے یادگار ایک ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام ایک کالج اور لائبریری قائم کریں گے جس میں میر صاحب کی کتب، نوادرات اور دوسری اشیاء محفوظ کی جائیں گی۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہم بلوچ ہیں آخر ناخن گوشت سے کیونکر جدا ہو سکتا ہے۔ انشاء اللہ ہمارے گھر کے اور ہمارے دل کے دروازے اپنے بلوچ بھائیوں کے لیے کھلے رہیں گے۔ ہم اپنے بزرگوں کے احباب سے کرمفرمائیوں اور مہربانیوں کی توقعات رکھتے ہیں۔

Regd L. No. 7156

Monthly **BALOCHI DUNYA** *Multan.*

